اسلام میں جمہوریت - بادشاہت اور شورائیت

عبدالماجد دریا آبادیؒ

[کئی برس پہلے حضرت مولانا دریابادی نے صدق میں جمہوریت کے خلاف ایک مضمون لکھا تو بہت تنقید ہوئی، اس کے جواب میں مولانا ماجدؒ نے ۱۶/جولائی تا ۱۳/اگست ۱۹۷۱ء صدق میں ان اعتراضات کا اجمالی جواب دیا۔ یہ جواب جمہوریت کے باب میں عالم اسلام کے غلط تصورات کی علمی تردید کے لیے کافی ہے۔ نومبر کے ساحل میں زاہد صدیق مغل صاحب نے جمہوریت کے چہرے کا اصل فلسفہ تحریر کیا ہے، اس مؤقف کی قرآنی تائیدی حضرت دریابادیؒ کے مضمون سے ہوتی ہے، ساحل]

خط پر خط چلے آرہے ہیں کہ صدق کے صیغۂ مراسلات میں جمہوریت پر طعن و مضحکہ کیسا؟ جمہوریت تو ایک برحق و مسلم نظام حکمرانی ہے اور اس پر تعریض و تضحیک کے معنی یہ ہیں کہ اصولی حقائق زندگی سے بھی بغاوت جائز ہے، اسی شبہ کو دور کرنے کے لیے چند سطریں عرض ہو رہی ہیں۔

قرآن کتاب موعظت خشیت و معرفت یا کتاب سائنس؟

قرآن مجید اصلاً کتاب ہدایت ہے۔ اس میں تبلیغ و تفہیم صرف انھیں احکامات اور مسائل کی کی گئی ہے، جو آخرت میں کام آنے والے ہیں اور انسان کو دائمی سکھ کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ان سے ہٹ کر جو چیزیں بھی ہیں، گو دنیوی و مادی نقطہ نظر سے کیسی ہی حقیقی بلکہ اصولی ہوں، قرآن مجید اگر ان کا ذکر کبھی کرتا بھی ہے تو محض ضمنی و ثانوی طور پر اور اجمال کو چھوڑ کر ان کی تفصیل کی طرف کبھی نہیں جاتا، طب اور ریاضی اور جغرافیہ سے بڑھ کر ضروری مسئلے کس علم و فن کے ہو سکتے ہیں، لیکن قرآن اگر ان کے مبادی کا بھی ذکر لاتا ہے، تو محض اشاروں میں اور ان کا رخ بھی تمام تر آخرت کی طرف پھیرے ہوئے اور انھیں مستقل اور مقصود بالذات قرار دے کر ایک بار بھی نہیں۔

قرآن میں علوم فنون تاریخ کا ذکر محض سبق آموزی کے لیے:

چاند، سورج، ستارے، آسمان، سمندر، پہاڑ جیسی مصنوعات اعظم کا بھی ذکر اگر کرے گا تو محض اسی حیثیت سے کہ وہ سب اللہ کے محکوم ہیں اور اس کی قدرت کے نشان ہیں۔ اپنی ہر حرکت وسکون کے لیے اس کے ارادہ اور حکم کے محتاج ہیں۔ طب کو بھی اگر وہ درمیان لائے گا تو محض یوں کہ اللہ ہی موت وحیات کا خالق ہے، مرض سے شفا دیتا ہے تو وہی، پھل اور میوے اسی کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ غرض جہاں بھی ذکر ہے، اسی دینی واخلاقی انداز میں موعظت وخشیت ومعرفت کے رنگ میں۔ مبصرانہ انداز میں ایک بار بھی نہیں۔ علوم وفنون کے درسی لب ولہجہ میں کہیں بھی نہیں، تاریخی تذکرے جتنے بھی آئے ہیں، سب اسی عبرت آموزی کے پیرایہ میں ہیں۔

قرآن اور دنیا کے چلے ہوئے نظام: چلی ہوئی اصطلاحیں

یہ بات نہیں کہ نزول قرآن کے زمانہ تک سیاسی تخیّل ناپید تھا۔ سیاسیات کے مبادیات سے بھی کوئی واقف نہ تھا، ہندوستان، مصر، چین وغیرہ میں جو کچھ ہو چکا تھا، اسے چھوڑیئے، یونان کے حکیم تو خوب ان بحثوں میں نام پیدا کر چکے تھے۔ [خصوصاً افلاطون اور ارسطو بلکہ افلاطون کی ''ری پبلک'' تو اردو میں بھی آ چکی ہے] اور ارسطو کی پالٹکس انگریزی میں عام ہے۔ اور ان کے بعد رومیوں نے تو اس فن پر دریا بہا دیئے اور صدیوں تک جمہوری وشہنشاہی دونوں طرح کی شاندار حکومت کر کے دکھا دی۔ لیکن قرآن ان ادنیٰ کرتبوں سے دوسرے علوم وفنون کی طرح ذرا بھی متاثر نہ ہوا اور اس نے مطلق فیصلہ نہ کیا کہ دنیا میں چلے ہوئے سیاسی نظاموں میں اسے فلاں فلاں پسند اور فلاں فلاں ناپسند ہیں۔ اس نے داؤدؑ وسلیمانؑ۔ طالوت ویوسفؑ اور ذوالقرنینؑ کی حکومتوں کا ذکر خاصی تفصیل کے ساتھ کیا۔ اور اس کے مقابل فرعون اور عمالقہ [قوما جبارین] اور ملکہ یمن [بلقیس] اور بخت نصر ایرانی [عبادا لنا اولی باس شدید] اور رومیوں کا بھی ذکر کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ کیا۔ لیکن یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ سیاست کی چلی ہوئی اصطلاحوں میں کس نظام کو کس نظام پر ترجیح دیتا ہے۔

قرآن: محض خلافت الٰہیہ کی اصطلاح

اس نے صراحت کے ساتھ نام صرف خلافت الٰہیہ کا لیا ہے اور تاکید صرف اس کی کی ہے کہ حق ملکیت یا اقتدار اعلیٰ صرف حق تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور بندہ ذمہ دار اور جواب دہ صرف خدا کے سامنے رہے گا، نہ کہ کسی سلطان وشہنشاہ کے یا کسی صدر یا وزیراعظم کے۔ کسی پارلیمینٹ کے، کسی مجلس ارکان کے، کسی ایوان عام یا ایوان خاص کے! ایک معتد بہ حصہ قرآن مجید کا کہنا چاہیے کہ اس دعویٰ کی تکرار سے بھرا ہوا ہے اور مختلف پیرایوں میں اس کا اشارہ ہے کہ۔

''ہر طرح کی مالک ومختار صرف اللہ کی ذات ہے، اس کا قانون سب پر بالا اور اس کا ارشاد سب سے

اعلیٰ ہے، اگر اپنی فلاح و بہبود مقصود ہے تو اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ اس کے بندے بن جاؤ۔

عبد صالح اور خلافت الٰہیہ کی خصوصیات:

اور عبد صالح کی جن صفات پر عبادت الٰہی کے بعد سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہیں۔

عدل۔ [ہر قسم کا جور و ظلم، جبر و غصب اس کے بعد بالکل حرام ہو گیا۔]

امانت۔ [اس نے ہر قسم کی رشوت، خیانت، بد دیانتی اور فریب کی ممانعت کر دی۔]

اطاعت اولی الامر۔ [غدر و فساد ہر قسم کا اس سے ناجائز ٹھہر گیا]

صدق۔ [جعل سازی۔ قمار بازی جلی و خفی ہر قسم کی اس سے ممنوع ٹھہر گئی۔]

رفاہِ خلق پر نظر اصلح و سازگاری کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے اور ہر قسم کے لسانی، وطنی اور نسلی تعصب کی جڑ کٹتی ہے۔]

اقتدار کا مقصد قیام صلوٰۃ و زکوٰۃ:

جن قوموں کی مدح آئی ہے، وہ کون ہیں؟ انھیں بھی پہچان لیجئے۔

الذین ان مکنا هم فی الارض اقاموا الصلوة و آتوا الزكوة و امروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ۔ [سورۂ حج رکوع ۶] [ترجمہ وہ لوگ جنھیں ہم تمکن فی الارض کی نعمت سے نوازتے ہیں، وہ نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں اور ہر قسم کی خیر کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔ اور ہر قسم کے شر و فساد سے روکتے رہتے ہیں۔]

جو قوم ان اوصاف و اخلاق سے موصوف ہوگی، وہ خود بخود ایک ''بہترین قوم'' بھی ہوگی۔ کسی بادشاہ کی رعایا ہو تو اور کسی جمہوری ملک کی باشندہ ہو تو، اصل کامیابی و کامرانی پر پہنچانے والے تو اس کے یہ اوصاف ہوتے ہیں، نہ کہ فلاں اصطلاح نظام حکومت! قرآنی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ''عبد صالح'' بن جاؤ، وہی سب کچھ ہو جاؤ گے، جس کا ہونا عام بشریت میں ممکن ہے۔

مشاورت: قرآن کا منصوص حکم

سارے قرآن میں صرف دو جگہ ایک ایسا لفظ آیا ہے، جس کا اشارہ کسی معلوم و متعین نظام حکومت کی طرف سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک یہ بیان ہے کہ مومنین کا یہ گروہ۔

وامرهم شوریٰ بینهم. [سورۂ شوریٰ ع ۴] اپنے معاملات باہمی صلاح و مشورہ سے کرتا رہتا ہے۔

''اور دوسری جگہ سالار اعظم ﷺ کو یہ حکم ملتا ہے کہ آپ اپنے رفیقوں و مطیعوں سے۔

وشاورهم في الامر . [آل عمران۔ع۱۶] مشورہ کرتے رہے اور باوجود اعلیٰ ترین انسان ہونے کے محض اپنی رائے پر اعتماد و تکیہ نہ کیے رہے تو جب باہمی صلاح و مشورہ کا حکم صاحب وحی کو مل رہا ہے تو ظاہر ہے کہ عام امتیوں کے لیے یہ حکم کس قدر موکد ہوگا۔

بس صلاح و مشورہ کی حد تک تو حکم اسلامی وقرآنی ہے، لیکن ڈیما کریسی [جمہوریت] محض یہیں تک تو محدود نہیں، اس کے سارے لوازم جو تہذیب و تمدن اور عقل فرنگ نے ناگزیر ٹھہرائے ہیں، وہ تمام تر اختراع انسانی ہیں، جن کے پیچھے کوئی ایمانی تقاضہ سہارا دینے کو موجود نہیں۔

نہ یہ ہے کہ صدر کو اکثریت کا مشورہ ماننا لازمی ہے۔ نہ یہ کہ صدر کا حق صرف ایک فاضل ووٹ (Casting Vote) تک محدود ہے۔ نہ یہ کہ صرف فلاں سن کے اور فلاں درجہ تک تعلیم پائے ہوئے لوگ ووٹ دے سکیں گے۔ نہ یہ کہ ممبری کا حق فلاں مدت تک محدود رہے گا۔ نہ یہ کہ رائے زنی منصوص اور شریعت الٰہی سے طے شدہ معاملات میں بھی ہو سکے گی۔ نہ یہ کہ مجلس شوریٰ یا صدر شوریٰ اپنے کو ذمہ دار و جواب دہ خلق کے سامنے سمجھے گی۔ خلیفہ ذمہ دار صرف خدا کے سامنے ہوتا ہے، نہ کہ پبلک کے یا اس کے کسی حصہ کے سامنے۔

جمہوری ممالک کا حال کیا ہے؟

جن ملکوں کی جمہوریت ہر طرح آراستہ و پیراستہ ہے اور جن کا سیاسی ضمیر خوب تربیت یافتہ ہے، خود ان کا حال کیا کم عبرت آموز ہے، نفاق و شقاق کی ہر روزہ ترقی دیکھ کر چہ جائیکہ ایسے ملکوں کی جمہوریت جو ایک طرف صرف نقالی کی منزل میں ہے اور جہاں الیکشن کا زمانہ بے پناہ شور و شغب، بھرپور گالم گلوچ اور پورے بغض و عداوت کا ریکارڈ قائم کر دیتا ہو۔ [جاپان اور اٹلی کو دیکھ لیں دس سالوں میں سینکڑوں حکومتیں ٹوٹ چکی ہیں، ساحل] اور جہاں سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ مسائل پر غور و فکر کے بجائے سارا زور بدزبانی اور شوریدہ سری پر ہو اور جہاں بات بات پر نئی نئی پارٹیاں گھاس پھوس کی طرح اگتی ہوں۔ اور جہاں یہی نہیں کہ کچھ لوگ مستقل اکثریت اور کچھ مستقل اقلیت میں ہوں، بلکہ جہاں مستقل اچھوت بھی بستے ہوں اور جہاں دلائل سے زیادہ تکیہ، بم اور چھرے پر ہو! ایسے ملکوں میں جمہوریت کو نعمت قرار دینا، لفظ ''نعمت'' کی مٹی پلید کرنا ہے، ہاں، جی چاہے تو ناگزیر مصیبت کے بجائے ناگزیر بے چارگی کہہ لیجئے، مغربی جمہوریت کے اولین بانیوں اور اصولی مفکروں مل بینتھم وغیرہ کی تحریریں بھی پڑھ لیجئے۔ پڑھنے میں دلچسپ نظر آئیں گی اور نوجوانوں کے خون کو گرم کر دینے والی بھی۔ لیکن ٹھوس حقائق کے لحاظ سے کچھ بے مغز سی! [اصلاً جمہوریت میں مہرا سمبلی کے نادان جاہل اراکین کی ہوتی ہے، اقتدار کی کنجیاں عیار بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہوتی ہیں کام وہ کرتے ہیں جاہل جو مسودے بھی نہیں پڑھ سکتے قانون سازی کرتے ہیں، ساحل]

حضرت داوٗدؑ وسلیمانؑ کا ذکر قرآن میں:

قرآن مجید نے دو نامور پیغمبروں اور اپنے وقت کے بہت بڑے تاجداروں کا ذکر موقع مدح پر بار بار کیا ہے، بلکہ ان میں سے تو ایک کے جاہ وحشم کی خاصی تفصیل بھی بیان کی ہے اور ان دونوں کو بہ طور مثالی فرماں رواؤں کے پیش کیا ہے۔ تاریخ کے صفحات بھی دونوں کی عظمت کی سرگزشت سے لبریز نظر آتے ہیں۔ بہ حیثیت انسان کے ان کا درجہ نہایت بلند تھا۔ صالحین، اولیاء ومقبولین ہی نہیں۔ ان کا شمار پیمبروں میں ہوا ہے اور مسلمانوں کا بچہ بچہ ان کے نام اور کام سے واقف ہے، داوٗدؑ اور سلیمانؑ۔

حضرت داوٗدؑ [سنہ ۱۰۲۴ تا سنہ ق م] شام وفلسطین کے بادشاہ تھے، ان کا نام قرآن مجید میں چھ مرتبہ آیا ہے۔

سلیمانؑ و داوٗدؑ کا طرز حکومت کیا تھا؟

حضرت سلیمانؑ کی حدود سلطنت اس سے بھی بڑھ کر مشرق میں دریائے فرات [عراق] تک وسیع ہو گئی تھی اور مغرب میں سرحد مصر تک۔ ان کا نام قرآن مجید میں پندرہ بار آیا ہے۔ ان دونوں عظیم سلطانوں کی بابت نہ کتاب اللہ میں ہے، نہ کسی حدیث نبوی میں اور نہ تاریخوں میں صراحتہ یا دلالتہ کہ ان کی بادشاہت، ڈیما کریسی یا ری پبلیکن ازم سے کوئی رشتہ رکھتی تھی۔ بلکہ حضرت سلیمانؑ کو تاج وتخت تو ورثہ میں اپنے والد سے ملا تھا، گویا ڈیما کریسی کی عین ضد!

دونوں بڑے عادل تھے، بڑے فہم وزیرک اور خوف خدا رکھنے والے تھے اور سلیمانؑ کی حکمت ودانائی نے تو ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ لیکن بہر حال دونوں بادشاہ ہی تھے اور بادشاہ اسی معنی میں، جس میں یہ لفظ مشرق ومغرب میں سمجھا جاتا ہے۔ جمہوریت کا اگر اسلام میں کوئی درجہ ہے اور یہ نظام حکومت خیر ہی کی کوئی شکل ہے تو آخر قرآن میں مثال کسی جمہوریت نواز کی کیوں نہ پیش کر دی گئی! [قرآن نے طرز حکومت کی شکل متعین نہ کر کے انسانوں کے لیے اپنی رافت ورحمت کا در کھلا رکھا، حضرت ابوبکر سے لے کر حضرت معاویہؓ تک پانچ صحابی خلفاء کے انتخاب پانچ مختلف طریقوں سے ہوئے لہٰذا یہ کہنا کہ صرف مغربی جمہوری طریقہ واحد اسلامی طریقہ ہے اسلام سے ناواقفیت ہے، ساحل]

حضرت یوسفؑ کا قرآن میں ذکر: کیا یہ جمہوریت تھی؟

ایک تیسرے نامور پیمبر کا نام قرآن مجید میں ۲۶ بار آیا ہے۔ یہ بادشاہ تو نہ تھے۔ لیکن ایک غیر مسلم بادشاہ کے نائب یا مدار المہام یا وزیر اعظم تھے۔ نام نامی حضرت یوسف [سنہ ۱۲۱۰ تا سنہ ۹۸۰ ق م] ان کو عملاً مصر میں شاہانہ اختیارات حاصل تھے۔ مملکت مصر کے سفید وسیاہ کے مالک تھے اور یہ حسن انتظام، فراست، دانائی، عفت وتقویٰ میں مقام عالی رکھتے تھے، لیکن یہ کہیں اشارۃً بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جواب دہ کسی اسمبلی، کسی کونسل، کسی

پارلیمنٹ کے سامنے تھے! جو فرمان چاہتے، بہ قلم خود جاری کر دیتے اور اپنے اوپر حاکم صرف اپنے ہدایت یافتہ اور روشن ضمیر کو جانتے!

قرآن میں حضرت طالوت کا ذکر: کیا یہ جمہوری عمل تھا؟

قرآن مجید نے ایک اور فرمانروا اور کشور کشا کا ذکر بھی موقع مدح پر کیا ہے اور داد ان کی ہمت و مردانگی کی دی ہے، ان کا نام قرآن کی زبان میں طالوت تھا اور توریت کی زبان میں ساؤل اور ان کا دور حکومت سنہ ۱۰۲۸ سے ۱۰۱۲ ق م تک رہا۔ ان کی امارت اور ان کی حاکمیت ان کی قوم کو ناگوار تھی۔ لیکن پیمبر وقت حضرت سموئیل کے ذریعہ سے انھیں کا انتخاب بارگاہ الٰہی سے ہوا اور عوام کے احتجاج کے باوجود وہی قائم رہا، جمہوریت کے عین منافی!

قرآن میں ذوالقرنین کا ذکر: کیا یہ جمہوری انسان تھے؟

پانچویں نمبر پر قرآن مجید کی ایک اور شخصیت بھی قابل ذکر ہے، کشور کشائی نہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک جہاں کشا کی۔ یہ مشرق میں گھوما اور مغرب میں بھی پھرا۔ سرکشوں اور ہیکڑوں کو اس نے زیر کیا۔ پیشہ ور حملہ آوروں کا اس نے سد باب کیا۔ قرآن نے اس شخصیت کو ذوالقرنین کے نام سے یاد کیا ہے اور گو اس کی شخصیت تاریخی حیثیت کا اب تک متفقہ طور پر تعین نہ ہو سکا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی ہو، بہر حال ایک خدا پرست شخص تھا۔ کہیں کوئی رہنمائی اس کی جانب نہیں ملتی کہ وہ جمہوریت کے تقاضوں سے دبا ہوا تھا۔ سرتاپا ایک مطلق العنان فرمانروا معلوم ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین کا انتخاب اور جمہوریت:

قرآنی شخصیتوں کے بعد خالص تاریخی دینی شخصیتوں کی طرف آیئے اور نظر کے سامنے چار راشد برحق خلیفہ ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ علیؓ آجاتے ہیں۔ ان چاروں میں سے کس کو اکثریت کے واسطہ سے انتخاب شدہ خلیفہ کہیے؟ چاروں کا طریق انتخاب ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کی بھی خلافت کو موجودہ جمہوریت کے تقاضوں کے ماتحت و مطابق کہہ سکتے ہیں؟ کسی کی بیعت کے وقت یہ شرط پیش ہوئی تھی [یا کسی کے ذہن میں بھی آئی تھی] کہ اطاعت اللہ اور اطاعت رسولؐ کے سوا مخلوق خدا کی رضا جوئی کو بھی مطمع نظر بنایئے۔ اور ووٹ دوڑ دوڑ کر رعایا سے اپنے حق میں حاصل کیجئے! کسی کا ذہن اس تک پہنچا تھا کہ اقتدار اعلیٰ رعایا یا عوام کا ہے بجز اس کے کہ چاروں عادل ترین، اور صالح ترین ہوئے۔ [عوام کے سہارے استحکام اور طاقت کو قرآن حبل الناس کہتا ہے، ساحل]

قرآن میں ملکہ بلقیس کا ذکر: درباری اور جمہوریت

ان پانچ کے علاوہ دو حکمراں یا تاجدار شخصیتوں کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، جو مسلم نہیں، بلکہ صراحتاً غیر مسلم تھیں اور ان کے طرز حکومت پر کچھ بہت ہلکی سی روشنی قرآن مجید ڈالتا ہے۔

ان میں ایک ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کی معاصر تھی، جس کا عہد حکومت سنہ ۸۸۹ ق م سنہ ۹۳۲ ق م رہا

ہے۔ اس کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں۔ موذخیں ومفسرین نے کہیں سے لے کر بلقیس لکھا ہے، اس کی سلطنت جنوبی عرب میں تھی، جہاں اب یمن، حضرموت اور عیسر کے علاقے واقع ہیں۔ یہ بڑا زرخیز ومتمول ملک تھا۔ عہد عتیق کے مختلف صحیفوں میں اس کی دولت وحشمت کے تذکرے آئے ہیں اور قرآن مجید میں یہ بلیغ فقرہ درج ہے کہ اسے سب ہی طرح کا ساز وسامان حاصل تھا۔ اور بعد میں یہ حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئی تھی۔ اور حبش کا موجودہ شاہی خاندان ممکن ہے کہ اسی نسل سے ہو۔

بہر حال قرآن سے ایک اشارہ ایسا ملتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اپنے درباریوں کا بہت لحاظ کرتی تھی۔ الفاظ قرآنی میں۔ **قالت یا ایھا الملاء افتونی فی امری ماکنت قاطعتہ امراحتی تشھدون.** [سورۂ نمل ع۳]

ملکہ نے کہا اے ارکان دولت تم میرے اس معاملہ میں اپنی رائے پیش کرو میرا دستور یہ رہا ہے کہ میں کسی امر کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم لوگ [ہمارے حضور میں] موجود نہ ہو اور اس رائے میں شریک نہ ہو۔

لیکن نیم جمہوری یا نیم پارلیمانی حکومت سے متعلق یہ نمایاں چیز نہیں، اس لیے کہ معاً بعد ارکان دولت جواب عرض ہے۔ **قالوانحن اولی قوۃ واولی باس شدید والامر الیک.**

بولے کہ ہم بڑے طاقتور ہیں اور سامان جنگ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن اختیار آپ ہی کا ہے۔

اس جواب نے اس نیم جمہوری حکومت والے شبہ کو چلنے نہ دیا۔ قرآن ہی نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ بلقیس اس وقت تک ایک کھلی ہوئی مشرک حکمراں تھی۔ اس سے نظیر اگر ملتی ہے تو ایک مشرک ہی کے نظام حکمرانی کی۔

قرآن میں فرعون کا ذکر:

دوسری تاجدار شخصیت فرعون کی ہے۔ فرعون مصر کے ایک شاہی خاندان کے فرمارواؤں کا لقب تھا۔ جو مدتوں مصر پر حکمران رہا۔ اس لقب کی شخصیت ایک ہی ہو یا حضرت موسیٰؑ کے معاصر دو فرعون ہوں، جیسا کہ عہد عتیق میں صراحت ہے یا اس سے بھی زائد ہوں۔ بہر حال اس لقب والی شخصیت کا ذکر قرآن میں بیسیوں بار آیا ہے۔ کہیں کہیں فرعون وملاءۃ بھی آیا ہے۔ لیکن نظام حکومت کا پتہ کہیں سے نہیں چلتا۔ ایک جگہ ہے کہ۔

قال لمن حولہ. فرعون نے اپنے گردوپیش والوں سے کہا۔ اور ایک جگہ ہے۔ **قال للملاء من حولہ.** فرعون نے اپنے گرد والے درباریوں سے کہا۔ لیکن یہ نہیں کھلتا کہ وہ درباری کس منصب ومنزلت کے تھے۔ اور نہ عہد عتیق سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے، بہ ظاہر یہ کہ فرعون جب مدعی سب سے بڑے دیوتا سورج کے مظہر یا اوتار کا تھا۔ تو عوام سے اس کی ہمسری اور ہم سطحی کا کیا ذکر ہو سکتا تھا۔ اور بالفرض کہیں سے عوامیت یا عوام شاہی اس کے ساتھ نکل بھی آئی۔ تو وہ تو کٹا کافر اور عدو اللہ ہونے کی ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے اسوہ کی تلاش ہی بے کار ہے۔ [صدق جدید ۱۶ جولائی تا ۱۳ اگست ۱۹۷۱ء]